

میں نے شاب کو ان تمیں کنواریوں کی آنکھوں سے دیکھا جو دل نہیں بنی ہاتھوں میں مندی رجائے۔ پیغمبر چین اور جب میجاہکی برات آئی تو وہ تمیوں سوتی رہیں اور دو لہاچلا گیا۔ میں نے انہیں اس اشفاق کی آنکھ سے دیکھا جو اپنی ہر محبت پر اپنی بھی مر لگا کر اسے بیٹھ کر لئے محفوظ کر لیتے ہیں۔ میں نے انہیں اس جگت گرد غم تھی کی نظر سے دیکھا جو سولڑ کرنے والوں کی عینک چرے پر لگائے شاب کی شعلہ روشنیت دیکھتا رہا گیا۔ میں نے انہیں عفت کی نگاہ سے دیکھا جو ایک ڈاکٹر کی نگاہ ہے۔ مجھ میں ابھی وہ بضیطہ و انتظام موجود ہے جو انہے شیشے کی طرح ہوتا ہے اور جس کے ہوتے ہوئے نہ کسی اور کسی خصیت کے پر کھلتے ہیں نہ اپنی حد کا پتہ چلتا ہے۔

میرے لئے شاب ابھی ہیں۔ میں سپر کا وقت ہوں اور وہ دوپہریا کا پھول ہیں۔ میرے ہوتے ہوئے وہ پر قینچ کبوتر کی طرح ستر ہتے ہیں۔ ان کاچھہ سیکڑت ایجنٹوں کی طرح واٹر پروف رہتا ہے اور اس چرے تے سوچ کی گھری کس طرح جلتی ہے اس کی کچھہ خبر نہیں ملتی۔

لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ اشفاق کے جملہ حلقوں کی طرح کسی روز شاب بھی دیکھرے ہو کر مجھ سے اشفاق کی بےاتفاقی کا ذکر کریں۔ اپنے گھر بیویوں کی گھنیاں کھولیں اس عمد کا ذکر کریں جب انہیں پہلی بار عشق ہوا تھا اور انہوں نے دھوڑے کا دو وہ نکال کر پینے کا پروگرام بنایا تھا۔ پھر میں بڑی اونچی بن کر کھوں..... ”شاب بھائی“ دراصل آپ اونچی جگہوں سے خوفزدہ ہیں۔ دوستوں کی آپ سے بےاتفاقی اس بات کی مظہر ہے کہ آپ کے بچپن کی بھنیں ابھی ناشگفتہ حالت میں آپ کے اندر Octopus کی صورت زندہ ہیں۔ آپ کے گھر بیویوں کے معمولی ہیں صرف آپ کی اذیت پسند طبیعت اس طریقہ کے اعجاز تغیر کرتی ہے تاکہ آپ بھنی آسودگی محسوس کر سکیں۔ آپ کا پہلا عشق اتنا ہم نہیں تھنا آپ اسے سمجھ رہے ہیں۔ بات صرف اُتنی ہے کہ آپ مجبوس پرندے کی طرح خود ترک کا شکار ہیں۔ اور اس خود تری سے اور کئی چیختے نکلتے ہیں..... ”

ابھی تک یہ وقت نہیں آیا ورنہ میرا مضمون زیادہ دلچسپ ہوتا اور آپ اس شاب کو بستر طور پر جان سکتے جس نے اپنے چرے پر ماسک پہن رکھا ہے اور ماسک پہننے کے بعد سے اترنے کا ذہنگ بھول چکا ہے..... ”

قیباً الہائیں سال پر انا یہ مضمون میں نے فقط اس لئے شامل تحریر کیا ہے کہ آپ کو یقین دلاؤں اس لئے عرصے میں گوہارے مراسم بڑھے، ہمیں ان کے ساتھ زیادہ وقت ملا۔ لیکن شاب بھائی کے تعارف میں اضافہ نہ ہوا۔ پہلے سنی سنائی پر شناخت موقوف تھی۔ اب حوالے بدلتے ہیں لیکن گیان میں اضافہ نہیں ہوا تھی میں نے مضبوطی، خان صاحب اور عفت کی عینک لگا کر انہیں دیکھا۔ اب دیکھنے کے زاویے بدلتے ضرور ہیں لیکن ناؤاقفیت کا وہی عالم ہے۔

کسی شخص کے قریب ہونے کا اثر ان گڑا اطمینان ہے۔ آپ اپنی کمیں اور دوسرے کی سیئں، افہام و تفہیم ہو، ڈائیلگ چلے، نظر یعنی سمجھے جائیں اور اطمینان کے دوران سمجھ میں آنے لگے کہ فلاں شخص کیا سوچتا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ اس کی آرزو نہیں کیا ہیں؟۔ وہ آپ سے کیا توقعات وابستہ رکھتا ہے؟..... اطمینان ہی کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ وہ شخص جس سے آپ واقفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں آپ کے مطلب کا آدمی ہے بھی یا نہیں۔

متاز مفتی اور یواں ادا فہام و تفہیم کے دو ادارے ہیں۔

مفہیمی کو گوئے لوگ پسند نہیں اور اللہ کی کرنی کہ وہ قدرت اللہ شماں سے وابستہ ہو گئے۔ جو بالکل اطمینان کے بندے نہ تھے۔ دس اگست ۱۹۶۹ء کو ننگہم سے شماں بھائی نے مجھے ایک خطا لکھا۔ مفتی می کی تھیم کتاب ”علی پور کالیلی“ کا دوسرا یہ یہ شن آرہا تھا اور اس کی تقریب زندگی کے سلسلے میں ایک جلسہ ہونے والا تھا۔ شماں بھائی نے اپنے خط میں مفتی می کے بارے میں جو کچھ لکھا اسے رقم کرتی ہوں.....

میر

”اگر علی پور کالیلی واقعی متاز مفتی ہے تو پھر وہ نوجوان یوڑھا کون ہے جو نہیں پھوپھو کا گھوڑا ہیں کر گھنٹوں تک گھنٹوں کے بل رینگتا رہتا ہے؟۔ وہ نحیف وزیار انسان کون ہے جو ایک آدمی..... ایک عورت نہیں..... ایک آدمی سے محض سرسری سی، محض فروٹی سی ملاقات کا وعدہ وفا کرنے کے لئے کڑکڑاتی ہوئی سردی اور موسلا دھار بارش میں ایک ناقابل اعتقاد پھیٹپھر سے باہمیکل پراندھیری رات میں سولہ میل جانے اور سولہ میل آنے کا تعجب یوں ختم ہے پیشانی سے برداشت کرتا ہے جیسے آتشدان کے سامنے بیٹھا کیسی ہاتھ سے چکنی بھار ہا ہو..... وہ عیش پسند درویش جو تمباکو والے چند پان کھا کر اور چائے کے چار پیالے پی کر زندگی کے منجود شام بڑی تن آسمانی سے گزار دیتا ہے؟۔ وہ ایذا طلب سنیا جو حج کے لئے رخت سفر باندھتا ہے تو احرام کی مدت کے لئے تمباکو والے پانوں کی لذت کو بھی یوں ہی بلا وجہ تیاگ دیتا ہے؟ وہ بے راہ رو حسن پرست جسے مکہ اور مدینے میں کالی آنکھوں اور سمری بالوں والی کنکن کی طرح دھکتی، تابنے کی طرح دمکتی اور گلاب کی طرح مسکتی، شامی، ترکی، مصری اور جازی عورتوں کی قطاروں کی قطاریں ایک بار بھی نظر نہیں آئیں؟..... وہ اڑیل ساہث دھرم ضمی بندہ جو اپنے اللہ کے سامنے بے نیاز اور اپنے رسول کے حضور عاجز ہے.....
بانو قدیسہ، دراصل یہ سوالات میں یوں بیسی بلا وجہ اور بے ضرورت پوچھ رہا ہوں..... شاید محض زیب داستان کے لئے۔ در نہج تو یہ ہے کہ جب میں پسلے پسل ممتاز مفتی سے ملا تو میں نے

فوراً فیصلہ کر لیا کہ بس یہ آدمی ضرور میرے ڈھب کا ہے۔ گر جوشی وہ جیسے گندھک کا الہا
چشمہ، سرد مری ایسی گویا جماہوا لگلیشیر، نری میں روئی کی حقیقت جو مدت سے مٹی کے دینے میں
سرسوں کے تیل میں گری پڑی ہو، حتیٰ میں نائی کا استرا، مٹھاس کاموڈہ ہو تو رس کا گھڑا دردہ
زپارا و کھاپیکا کھدر سالا تعلق انسان جو اپنے دل کی کڑوی سے کڑوی لیکن پچی باتیوں کے
گزرتا ہے جیسے موسم کا حال بیان کر رہا ہو۔ یہ تو بھلا ہوا فسانہ نگاری کا، کہ اس فن نے متاز
مفہت کو بیان کا دہا اعجاز عطا کر رکھا ہے کہ اس کی ہر حقیقت پر افسانے کا گمان ہونے لگتا ہے اور ہر
افسانے پر حقیقت کا..... اگر فن کا یہ چور دروازہ متاز مفتی کو راہ نہ دیتا تو اب تک وہ کبھی کا
جرائم پیشہ سرگرمیوں میں مانوذہ ہو کر کیفر کردار تک پہنچ پہنچتا ہوا یا کاد کاراہ گیروں کو پکڑ کر
گھیر گھار کر بڑی منت سماجت، بڑی لجاجت سے نماز پڑھنے کی تلقین کیا کرتا اور اگر کوئی
سادہ لوح مسافر اس کی باتوں میں آکر باتا قاعدہ وضو کر کے نماز کی نیت باندھ بھی لیتا تو متاز مفتی
نمایت بے اعتنائی سے سگریٹ سلاگا کر الگ تھلگ بیٹھ جاتا اور دل ہی دل میں تعجب کرتا کہ اللہ
کی بھی کیا شان ہے کہ ابھی تک ایسے ایسے اچھے اچھے لوگ موجود ہیں جو ہنسی خوشی نماز تک
پڑھ گزرتے ہیں!.....

یہ بات نہیں کہ متاز مفتی کسی قسم کے عقیدے میں گرفتار ہے وہ تو یک ایسا آزاد منش
ہے جو عقیدے کاروگ پال ہی نہیں سکتا۔ اس کے سارے وجود میں عقیدہ نہیں بلکہ عقیدت
جادی و ساری ہے۔ عقیدت بھی وہ جس میں حدت بھی خوب، شدت بھی خوب اور جدت بھی
خوب! اب اس عقیدت کا شکار کون ہوتا ہے اس کا درودار یا صحن اتفاق پر ہے یا محض حادثہ
پر..... اگر عورت ہے تو جنس، دوست ہے تو محبت، دشمن ہے تو نفرت..... اور جب کسی وقت
متاز مفتی کی عقیدت کے جال میں نہ عورت پھنسی ہوئی ہو، نہ دوست اور نہ دشمن تو وہ اچانک
راہ چلتے چلتے کسی میرے جیسے لاوارٹ کو آنکھ بچا کر اخalta ہے۔ اسے گود میں بھاتا ہے،
کندھوں پر اخalta ہے، کھلاتا ہے، پلاتا ہے، پاتا ہے، پوستا ہے، بال بڑھ جائیں تو کھوتا نہیں بلکہ
لانبی لانبی زلفوں پر گوئے کناری والا سبز لمکل کاصافہ باندھ دیتا ہے۔ داڑھی نکلے تو اس پر مشک
کافور کی نکیاں سجا رہتا ہے، آنکھوں میں دنبالہ وار سرمہ لگا رہتا ہے اور پھر اسے میدان میں نکال
کر بآواز بلند کرتا ہے ”کہ ہاں پچھ جورے تمہارا نام کیا؟..... تمہارا کام کیا؟..... تمہارا دام
کیا؟“

بہ امر مجبوری پچھ جورے صحیح جواب دیتا ہے لیکن اگر کوئی جواب متاز مفتی کی عقیدت کے
سائے میں پورا نہ اترے تو وہ اندر ہی اندر اسے ایسے غفیر گھونے مارتا ہے کہ بے چاراچھ جمora

بُری و بُھی سکنے لگتا ہے جو ممتاز مفتی کی عقیدت چاہتی ہے کہ وہ کسے
عقیدت کے میدان میں ممتاز مفتی وہ خر کار ہے جو معصوم پوچن کو اغا کر کے ان کی
انگلیاں توڑتا ہے، ان کی بہیاں مرود تاتا ہے تاکہ وہ اس کے اور صرف اس کے سانچے میں فٹ ہو
سکیں۔ شریعت میں وہ خاموش ہے کیونکہ اسے اپنے رسول سے ایسا انس ہے جو شاید ضرورت
کے بغیر بھی مچھلی کو پانی سے ہونا چاہئے..... طریقت میں وہ بے شک بڑا طرحدار ہے، اگر تصور
میں غنڈہ ایکٹ نافذ ہوتا تو ممتاز مفتی دائی ی ٹھانٹ پر زندگی گزارتا..... مرنے کے بعد اگر وہ جنت
میں گیا تو شاید اسی وجہ سے جائے کہ آخر وہاں کی جبلیں بھی تو کسی نے آباد کرنی ہیں۔
یوں روزمرہ کی زندگی میں ممتاز مفتی سرکس کا "سائنس مار" ہے۔ وہ ہر وقت لنگر لنگوٹ
کے، بدن پر تیل ملے، سدھے سدھائے ہاتھیوں اور بندھے بندھائے شیروں کو سائنس مار مار
کر مزید سدھارتا اور مزید باندھتا رہتا ہے۔ "علی پور کالی" اسی سرکس کی ایک جھلک ہے،

اس خط سے ممتاز مفتی کی جو جھلک آپ نے دیکھی اس میں اضافے کے لئے ایک اور خط کا حوالہ
پیش کرتی ہوں.....

۱۵ ستمبر ۱۹۷۰ء

بانو بن!

بورڈ کی مینگنگ میں ایک خوبصورت سی ٹرکی نے ابھی ابھی آپ کا خط مجھے لا کر دیا ہے۔
پتہ نہیں کس کا شکریہ ادا کروں۔ فی الفور جواب لکھ رہا ہوں۔
مفتی جی کی باتوں پر زیادہ نہ جائیں، وہ بڑے آدمی ہیں۔ بڑے ہیں کیونکہ نر آدمی ہیں۔
مجھے نہ پیری پسند ہے نہ فقیری۔ میں تو محض ایک سید حاسدا اساعیش پسند انسان ہوں۔
جب عیش میسر ہو تو اللہ کا احسان ہے جب نہ ہو تو بھی اس کی دین ہے۔ پتہ نہیں کس طرح.....
لیکن کسی طرح کھجھن کھاج کر اب میں اس منزل تک پہنچ گیا ہوں جہاں مدح و ذم کیساں ہیں۔
اس منزل میں میری واحد آزمائش مفتی جی ہیں۔ وہ چاکب مازمار کر حکم دیتے ہیں کہ اپنی تعریف
سنوار خوش رہو۔

میں تعریفیں..... سنتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں..... لیکن جب کوئی میرے غلاف کچھ کھتایا
کرتا ہے اس پر بھی واللہ رنجیدہ نہیں ہوتا۔

آپ کا بھائی

قدرت اللہ شاہ

یہ دونوں خطر قم کرنے سے میری مراد یہ تھی کہ آپ خود دیکھ لیں کہ اظہار کس قدر برا جحاب ہے۔ مفتی جی اور یو این او کی پالیسی کتنی الحمداللہ نہیں والی ہے۔ شاہ بھائی نے جتنی خوبی سے مفتی جی کی شخصیت کو باجا کر کیا ہے اس سے کیس زیادہ چاہکہستی سے اظہار ہی کا سارا لے کر اپنی ذات پر پردہ ڈال گئے ہیں۔ شاہ بھائی سے قدرت اللہ شاہ کی پاتنی کرنا ایسے ہی تھا جیسے داؤں میں گھومنا، انہیں میں ٹھوٹ لانا، زیر آب تیرنا، بھوم میں کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا جو گروہ میں موجود ہی نہیں۔ گواہ اظہار کا وسیلہ اور افہام و تفہیم کا اصول شاہ بھائی کو جانے میں مدد نہیں دے سکا۔ لیکن مفتی جی کے کپے ادیب ہیں۔ ان کا اور ہذا پچھونا سونا جا گناہ لفظ ہے۔ وہ جب بھی سوچتے سمجھتے جانتے ہیں لغنوں کا سارا لیتے ہیں اسی لئے ان کے اور میرے درمیان ایک عرصے سے صرف تین لفظ زندہ ہیں۔

قدرت اللہ شاہ.....!

ہم دونوں پسلے اس موضوع پراتفاق کرتے ہیں پھر جھگڑتے ہیں۔ مفتی جی کبھی مجھے حلقة ارادت سے نکال چھکتے ہیں کبھی دلار سے دوبارہ دوز انو ہونے کا حکم دیتے ہیں۔ قدرت اللہ شاہ مفتی جی کی ملکیت، ان کا مسلک، نظریہ، آنکن، تکمیل، چوپال، گھر، وجہ زیست سب کچھ ہے۔ میں ناری ہوں دنیا سے بندھی ہوں اولاد پالنے کے فریب میں بمتلا ہوں۔ پتی بھگتی کو دھرم سمجھتی ہوں۔ میرے لئے راستے کے کمی جاپ ہیں۔ مفتی جی کو ان چلنوں سے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ وہ مجھے جیسی عارف دنیا کو عارف مولیٰ بنانے میں کچھ اس درجہ اصرار اور شدت برنتے ہیں کہ میں بدک جاتی ہوں اور مفتی جی کو اپنی قروی اپنی نیام میں واپس دھرنی پڑتی ہے۔

جن دونوں شاہ بھائی باتحہ آئی لینڈ میں مقیم تھے اور اسکندر مرزا کے سیکرٹری تھے ہم غریب نادار میاں یہوئی کمی رضا یاں گدے لپیٹ بتت کا بسترا ہوں ڈال میں باندھ کر اچی گئے تھے۔ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوئی اس کی روئیداد آپ پڑھ چکے ہیں۔ مفتی جی نے وہیں خان صاحب پر یہ الزام لگایا کہ اشفاق افسر باز، اقتدار پسند اور جھوپی چک آدمی ہے..... کر اچی ہی کے قیام میں مجھ پر صرف اتنا کھلا کہ شاہ بھائی بڑے جھینپو، کم گو، شرمیلے اور ہلکے ہلکے سے بے ضر شراری آدمی ہیں۔

کر اچی کے بعد کئی سال مفتی جی سے شاہ صاحب کی کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ اسلام آباد منتقل ہو گئے۔ جوں جوں ان کا تعلق شاہ صاحب سے مضبوط ہونے لگا مفتی جی کو خوش کرنا مشکل کام بنتا گیا۔ مفتی جی بڑے رواتی مہمان نواز ہیں۔ لیکن وہ چاہتے ہیں کہ لوگ انہیں غیر مقلدا اور بے پرواہ بھیں۔ وہ ایک عرصہ تک صحیح دشام شاہ بھائی کو پان لگا کر دینے جاتے رہے۔ ہم اسلام آباد جاتے تو مفتی جی پڑیوں میں پان لپیٹ کر خان کو بھی دینے آ جاتے۔ اس دستوری پر اگر ہم شکریہ ادا کر بیٹھتے تو مفتی جی کہتے..... ”اوے بلئے ہم سے خاطر دار یاں نہیں ہوتیں، دنیادار یاں نہیں بھتیں“۔

مفتی جی کو اپنے دوست بڑے پیارے ہیں۔ پروہ ان دوستوں کی کچھ ادائیگیں برداشت نہیں کر سکتے۔ جتنا ان کا تعلق گمراہوتا ہے اسی قدر وہ دوست کو اپنے دوست قدرت میں رکھنا چاہتے ہیں۔ دوست اپنی مرضی، طبیعت، ملک، حالات، عمر کے تقاضوں کے تحت فعال نہیں ہو سکتا۔ دوست کو ہر گزہر گزیہ اجازت نہیں ملتی کہ کبھی کبھی دہ بھی کہیں، عضیل، احمد، جھونٹا، دل پھینک، غیبت باز اور بے فیض ہو جایا کرے۔ شاب بھائی کے قرب نے مفتی جی میں انسانی کمزوریوں کے لئے حوصلہ کم کر دیا ہے ان کے پاس جب سے سونے کا گزر آیا دوستی کی ساری برازی فیل ہو گئی ارب تمام دوست کوئی گرہ کم ہے کوئی انجیزیاہ بجونی مفتی جی محسوس کرتے ہیں کہ فلاں دوست ان کے گزپر ناپنے کے قابل نہیں وہ اپنی پھٹیوں کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ پہلے القاب بدلتا ہے پھر تحریر میں تو سے آپ کا تکلف شروع ہوتا ہے۔ دوست ان تینیسوی خطوط کے باوصف پھر بھی چھوٹا، دنیادار اور کمزور رہنے پر مصروف ہے تو مفتی جی اسے بیک بنی اور دو گوش آنکن بدر کر دیتے ہیں۔ اور پھر دل ہی دل میں سوچتے ہیں کمال ہے اتنی چھوٹی سی بات نہیں سمجھتا آخر شاب بھی تو ہے..... کیا آدمی ہے کیبات ہے؟۔

سونے کے گز سے سب سے زیادہ نقصان، بے قدری، حق تلفی عکسی مفتی اور اشfaq احمد کی ہوئی۔ یہ دونوں مفتی جی سے اتنی زیادہ محبت کرتے ہیں کہ انہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ مفتی جی کے بے نوک عتابی خط پاکر مضمضل ہوتے ہیں۔ لیکن اپنا آپ بدل نہیں سکتے۔ عکسی سمجھ نہیں سکتا کہ اس کا باپا سے سونے کے گز سے کیوں ناپ رہا ہے۔ خان سمجھ توجاتے ہیں لیکن مفتی جی کی اس بے کبھی پران کا اختیار نہیں چلتا۔ عکسی مفتی اور اشFAQ احمد کی توفیق اتنی خواہش ہے کہ مفتی جی جس انہیں بونے سمجھ کر آنکن میں اچھل کو دمنانے دیں ہر درخت کی ڈالی پر چڑھ کر ایک ہاتھ سے ڈالی پکڑ کر زور سے ہلا کیں اور کہیں ”لک مفتی جی نوہندز..... نوہندز.....“ لیکن مفتی جی نہ تالی بجائتے ہیں نہ خوش ہوتے ہیں۔ وہ ان دونوں کا ایک اور یورو و کریٹ سے مقابلہ کرتے ہوئے دل میں زخم ہو کر کہتے ہیں ”غیوڑ لارڈز..... یورو و کریٹ کمیلس شو آف سیلف میدیو نے“۔

قیام پاکستان کے بعد جو پود بڑے شہروں میں پناہ گزیں ہوئی ان لوگوں میں جو ان سالوں پر عجیب اثر ہوا۔ وہ سائل سے نپتہ نپتہ جوں توں اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے اور جونی انہیں اپنے دوست و بازو پر اعتماد پیدا ہوا ایک پوری کھیپ سیلف میدیا فر کلاس، بُرنیں میں، شاعر، ادیب، ایکٹروں، ڈاکٹروں کی پیدا ہو گئی۔ پاکستان میں ہر پروفیشن میں جو لوگ بالکل چوٹی پر نظر آتے ہیں وہ عموماً سیلف میدیہ ہیں۔ عکسی مفتی اور خان صاحب بھی سیلف میدیہ ہیں۔ ان میں اور شاب بھائی میں ایک بنیادی فرق یہ بھی تھا۔ شاب بھائی کبھی میدیتھے ہی نہیں۔ وہ پری میدی آئے تھے انہوں نے دنیاوی اعتبار سے کبھی کچھ کرنے، بننے، آگے بڑھنے، چیپے رہ جانے، جھنڈا گاڑنے، متاثر ہونے یا کرنے کے لئے اصرار یا تلاش نہ کی تھی۔ وہ بس پیدل مسافر کی طرح چھڑی کے سرے پر روٹی کی پوٹی باندھے چلتے رہے تھے جو کچھ راستے میں

آجاتا، کر گزرتے۔ چاہے یہ آئی سی ایس کا امتحان ہوتا یا چند راتی کی کشافت بھری بوریاں دھوٹا۔..... چاہے یہ اسرائیل کا سفر ہوتا یا یگ کی ایمپسڈر می۔..... وہ تلاش، اصرار، تجویر، اہتمام کے بغیر، جو بھی کام پڑوست، ہوتا وجہ، خوش دلی اور محبت سے کر دیتے۔ جس قدر کام لائقی سے کرتے اتنا ہی وہ مدح و ذم کے پکڑ سے نکل جاتے۔ ”شاب نام“ پبلک میں عام ہونے سے پہلے انہوں نے پردہ کر لیا اک اس سے حاصل ہونے والی تعریف ان میں مدح کا اشتیاق پیدا نہ کر دے۔

بر صغیر میں عموماً چار خوبیاں تکمیل ہوں تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے ورنہ اپنا آپ منوانے کے لئے مقابل کے بنیانے میں اپنی ہی بانہ ڈال کر محنت کارس نکلوانا پڑتا ہے۔ اگر انسان امیر ہو، انگریزی کے لجے میں وہ ازتا سانپ بن سکتا ہے، اگر دواکن کوائف کم ہوں تو تھنثی لزتا ہے اور اپنے آئی کیوار محنت کا سارا لے کر سیلف میڈ آدمی بن جاتا ہے..... ہمارے معاشرے میں ایک مدت سے اپنی بڑائی کے یہ چار تعویز کام آتے رہے ہیں۔ جس شخص کے پاس ان کی کمی ہو اس کی عزت ہمارے معاشرے میں حال نہیں رہ سکتی۔ فقط تحقیق پر بھری گاری بے ضرر انسان ہو تو ہمارے معاشرے میں لوگ اسے ایویں کہوں ہی سمجھیں گے۔

سیلف میڈ آدمی کی آتش پڑی احساس کمتری کی تیلی سے سلگتی ہے اور ممالہ ختم ہونے کے بعد بھی شعلے جھاڑتی رہتی ہے۔ مسٹر سیلف میڈ زندگی میں اتنی ٹھوکریں، کشمکش، مشکلات، زیادتی، دھانعمل، نکتہ چینی سسمہ چلتا ہے کہ اس میں کے کنتری میں چبڑا جاتے ہیں۔ جیسے وہ اونچے پہاڑ کے پھرروں سے مکراتا آیا ہو..... سیلف میڈ ایک خاص ڈھب کا آدمی ہوتا ہے کیونکہ اس کی بنیادی پرورش بڑی روایت پسند، سادہ مرادی عورت نے کی ہوتی ہے جو سے چھوٹوں سے پیار، بڑوں کا دب، مال کے پاؤں تلے جنت، عورت کا ڈولی میں آنا اور کندھوں پر جانا وغیرہ وغیرہ قسم کے نظریات کی چھاؤں تلے پالتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ترقی کی دیوی وقت اور پوزیشن کے ساتھ ساتھ اسے فقط

Information oriented بنا دیتی ہے۔ مال کے نظریات پر اس کا ایمان نہیں ہوتا اور انفرمیشن اس کا حال نہیں ہوتی۔ اس نظریاتی دورخی کے باعث سیلف میڈ لوگ عموماً حدود حصول میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک ان کا خود مختار سیلف ہوتا ہے۔ جسے پروفیشن میں کامیابی مانجا چڑھاتی ہے اور ایک ان کے اندر کا برا انکر چوڑہ جو ہر بھلی کے بلب کے پاس جا کر اس لئے رک جاتا ہے کہ اس میں اسے عافیت، گری اور مامتنظر آتی ہے۔ سیلف میڈ آدمی کی مشکل یہ ہے کہ اپنے دو سیلف لے کر دور استوں پر چلتا ہے اور یہ راستے کمیں نہیں ملتے۔ وہ فل لوڑو کار میں انگریزی موسیقی بھی سنتا ہے اور فوک لکچر میں بھی اس کی جان پہنچی رہتی ہے۔ دانشوری کے تمام ہتھکنڈوں سے لیس ہو کر جنگ بر صورت وہ معصومیت کی جیتنا چاہتا



عکس منی، قدرت اللہ شہاب، نسیم منی

ہے۔ دن بھر جب یہ کاغذی شیر آرڈر دیتا، آگے بڑھتا، مسحورے پھینکتا، جھٹکیاں سناتا، کافی نہشنا ہے۔ حاصل کر لیتا ہے تو اپنی سو گوار شامیں کسی کتاب، ڈاکٹر کے پھینک، ٹوی کے آگے، چوری کے معاشرے، ہات و اڑیاں، بچوں کی خوشابد، ٹراگوولائزر احساس جرم کے حوالے کر دیتا ہے۔ جب ان ساروں سے بھی جھپکی نہیں ملتی تو سردیوں کی رات کے پچھلے پروہ و کھوں کا کبل ذرا سا چہرے سے اٹھا کر کرتا ہے۔

تاروں والی رات کے نیچے جاگتے جاگتے رات کی

دن تکلا تو کار جماں کو جوں توں بھی اپنانا ہو گا

شمیں کا چہرہ زرد ہوا ہے خاک پر رکھو پیشانی

کہ دو ورو دیا تو داتا درماں بھی بتلانا ہو گا

مفتی جی پچے کمرے اور محبت کرنے والے آدمی ہیں۔ انہیں کسی سیلف میڈی آدمی پر زیادہ دیہ

محبت نہیں آتی۔ وہ مور کا ناج دیر تک دیکھ نہیں سکتے لیکن شاب بھائی لکھ مانوں ہیڈر ڈاؤگ،

بھرن پھسن کمزور سیلف میڈی آدمی کے ساتھی تھے۔ شاب بھائی تمام یہاؤں اور قیمبوں کے ول

سے ہمدرد تھے۔ انہیں کمزور آدمی کی بیساکھی بننے کا شوق تھا۔ شرابی، لپایا، راندہ در گاہ ان کے

زندگی ہمدردی کا مستحق تھا۔ اپنے سے مختلف سلک والے کی ان سے خوب بنتی تھی۔ وہ اختلاف اور

تضاد کے باوجود ہمدردی بانٹ سکتے تھے۔ محبت کر سکتے تھے۔

اسی لئے پہلی نظر میں انہوں نے سیلف میڈی عکسی مفتی کا منتخب کیا اور ہمیشہ اپنی محبت کی لوئی سے

اے ڈھانپے رکھا۔ وہ جب بھی عکسی کی بات کرتے ان کا لجہ ماتھا سے بھیگا، ہوتا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ

عکسی یہو بھی ہے اور یہم بھی..... یہو وہ اس لئے تھا کہ بے سار اتحا اور یہم وہ اس ضمن میں تھا کہ اتنے

بڑے باپ کا پیٹا باپ کی شکل ایسے ہی دیکھتا تھا جیسے جملہ کی پیٹاں ماڈنٹ ایورسٹ کو دیکھتی ہیں اور اس کا

کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔

ان دونوں ہم ماڈل ٹاؤن میں سر کلر روڈ سے کچھ پیچھے ہٹ کر جی۔ ۵۷ میں رہتے تھے۔ عکسی نیانیا

چیکو سلوو ایکہ سے ہو کر آیا تھا۔ اس کی آواز میں امید، چال میں ہمت اور پروگراموں میں جذبہ تھا۔ لیکن

نوکری کمیں آس پاس نہ تھی۔ عکسی میں پچھیں دن ہمارے پاس رہ کر جب چلا گیا تو مجھے خوف آئے

لگا۔ وہ اتنا پر امیدوار مغربی نظر آرہا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہیں ہمارے مشرقی باخوں میں اس کا مستقبل محدود ش

نہ ہو جائے۔ ان ہی دونوں عفت اور شاب بھائی ہمارے گھر آئے۔

چھوٹے سے کھانے کے کرے میں، جماں گلابی پر دوں کی روشنی میں عفت کا چہرہ عنابی شابی

لگ رہا تھا میں نے کچھ جھپک کر عکسی کی بات کی۔ شاب بھائی کی آواز چہرہ ہاتھ سب مال کے بن گئے وہ

پریم بھری آواز میں روئے "آپ فکر نہ کریں عکسی کے لئے ہو رہا ہے" -

"کیا شاب بھائی؟"

”بس ہو رہا ہے.....“

”کیا آپ نے کمیں سفارش کی ہے؟“

”نہیں.....“

”کیا آپ کمیں سفارش کریں گے؟“

”نہیں۔۔۔“

بھلا جب سفارش نہ کی گئی اور نہ ہی کرنے کا ارادہ ہے وہاں کام کیسے بنے گا میں نے ان سے پوچھا..... ”کیا آپ کے دفتر میں جگہ ہے؟“

”نہیں.....“

”تو پھر شاب بھائی عکسی کا کیا ہو گا؟“

”بس آپ فکر نہ کریں..... ضرور پکھ اچھا ہو گا“

اس لئے اصرار پر خان صاحب نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں چپ ہو گئی۔ تب مجھے معلوم نہ تھا کہ شاب بھائی اسی طرح مدد کرتے ہیں۔ نہ وہ فائل چلاتے، نہ کسی سے سفارش کرتے، نہ اپنے عمدے کا دباوڈا لاتے، کسی دوستی رشتہ داری کا حوالہ بھی نہ دیتے..... بس وہ کسی اور درگاہ میں کسی اور حضوری میں اپنی کالی صندوقچی میں درخواست بند کر کے لے جاتے وہاں کی مظاہری کے بعد دنیا خود بخود صاد کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ شاب بھائی جب کسی کے خیر خواہ ہو جاتے، کسی پر اپنی نظر کی رداہاں دیتے ہیں اس کے لئے خیر خواہی کا جذبہ محسوس کرنے لگتے تو پھر ان کی خواہش سے ہی احکامات جاری ہو جاتے، کام بننے لگتے، حالات سدھرنے لگتے۔ وہ چاہے انشاع جی ہوں، خان صاحب کا گھرانہ ہو، مفتی جی کے گھر والے ہوں، شیماجید کا نحیف وجود ہو..... اشارہ راعی ہو، جیل الدین عالی ہوں..... برکیں کھل جاتیں، راستے ہموار ہو جاتے، سب کی گاڑیاں اپنے اپنے پڑوں سے چلے لگتیں۔

شاب بھائی کی دعا کرو روئیدگی، پرورش اور برکت سے گمراحتا تھا۔ ایک آشیرواد ملتے ہی ہو لے ہوئے نامعلوم طریقے سے نامحسوس انداز میں با ججدھ درخت پھل لانے لگتے۔ بیلیں ہری ہو جاتیں..... خنک ان ڈور پلٹنیش میں نئے سرے سے پیتاں نکل آتیں، انگوروں کی بیل میں پھل زیادہ آتا، میگنڈیا کے پوڈے کو پھول بے تحاشا لگتے..... کوتuron کے بچے کوئے اڑا کر نہ لے جاسکتے، لان کے خنک حصوں میں خود بسراہ پھیلنے لگتا..... روئیدگی کا الم بالسلسلہ چل نکلتا۔

توجہ کی نگاہ پر جانے پر آپ نوکری کے پروانے آجائے..... گھر کے لئے بغیر چکر لگائے قرضہ مل جاتا..... بیٹی کے رشتے کی بات پکی ہو جاتی..... گودیوں میں بیٹے پوتے آجائے..... ہپتال سے بھلی خبر آتی..... اچانک پرائز بونڈ نکل آتا..... چوری کا سامان چور گھر پھوڑ جاتے..... کم تجوہ پر اچھا ملازم مل

جانا..... قالینوں پر ہم خیال دوست آکر بیٹھنے لگتے خوشخبری کا سلسلہ پھیل جاتا۔

شاب بھائی مائل ہے کرم ہوتے تو میزوں پر پھل، گلاسوں میں دودھ، چھابے میں روٹیاں بچتے ہیں، بھلی کامل کم آتا، گریڈ اور پنچ زیادہ ہو جاتی، بنکوں میں پیسہ بڑھ جاتا، ٹرانسفر خود بخود رک جاتی..... سرکاری خرچ پر بیرون ملک سفر طے پا جاتا..... بیٹھے بھائے یہوی اچھی لگتی اور اس کے رشتے داروں پر ترس آنے لگتا..... بازاروں میں دکاندار کو کا کولا منگا کر اصرار سے پلاتے..... درزی ہر کپڑا درست سی کر لانے لگتا..... یکدم آپ افسر کی منوجھ کابل بن جاتے..... موڑ سائیکل پہلی گل میں چلنے لگتا..... چھوٹی بڑی ہر قسم کی گذلک کا ڈبیر گل جاتا۔

ان سے خواہشات کے افمار کی ضرورت نہ تھی۔ وہ جماں ہوتے وہاں کی ضرورت محسوس کر لیتے اور پھر ایک ایسی جگہ جا کر انجام کرتے جہاں سے وہ بھی خالی ہاتھ نہ لوٹے تھے..... برسوں کی بیماری تکلیف جاتی..... مقدمہ حق میں ہو جاتا، جانی دشمن ایک روز مٹھائی کا نوکر الٹھائے معانی مانگنے آ جاتا، ہمسائے نہیں کر سلام کرنے لگتے، یہوی کام عاشق کسی اور کے ساتھ بھاگ جاتا، نیچے خود کتابیں لے کر پڑھنے لگتے، بلاوجہ برسوں سے گھبرا یا ہوا دل ہر جگہ خوش رہنے لگتا، خیر ہی خیر ہو جاتی..... آئندھیتا..... سر سے لوہے کی ٹوپی، پیروں سے تنگ ہوتی، کمپر کسی ہوئی بلٹ، گردوں میں جکڑی ہوئی ٹائی، کلائی کو کھینچنے والی گھڑی کی شین لیس سینل کی چین، تنگ انگوٹھی، خون نکالنے والے آدیزے..... چینے والی زپ، سب سے پتہ نہیں کیسے چھکاراں جاتا۔

جب شاب بھائی کی Wishing سے عکسی کو توکری ملی تو عکسی نے لاہور میں اول اول فوک لور سفر بنا یا۔ اس کی بلندگی ہمارے گھر سے کچھ دور نہ تھی۔ وہ اپنے دفتر کو کیپس، پیپر اسی رزاق کو آفیسر اور نوکری کو تحفہ سمجھتا تھا ان دونوں میں شاب صاحب کی اس جست کوئہ جانتی تھی۔ کیپس اور آفیسر تک میں نے مان لیا لیکن مجھے یہ یقین نہیں آتا تھا کہ عکسی کو اس کا جوب چاندی کی قہاڑی پر آپی آپ بغیر کسی کوشش کے ملا ہو۔

ایک شام اپنی کے درخت کے پاس عکسی اور میں بیٹھے تھے عکسی کی ایک بڑی عادت یہ ہے کہ وہ محبت بھری ٹھنگو کر تاکہ تا اچانک پہاڑ کے پیچے جا چھپتا ہے اور کورا اجنبی بن جاتا ہے۔ مفتی جی ایک موڈ کے آدمی ہیں۔ عکسی کے ہر موڈ میں کئی اور موڈ چھپے ہوتے ہیں۔ وہ ہستے ہوئے روتا ہے بات کرتے کرتے کہیں اور پہنچ جاتا ہے اور موجودہ کر محسوس نہیں ہوتا۔ تیوں نیچے لان میں کھیل رہے تھے۔

بیشک طرح عکسی شاب صاحب کے متعلق کچھ بتانا کچھ چھپانا چاہتا تھا۔

”قدسی تمہیں معلوم نہیں ہے“ - Shahab is a power

”کیا مطلب؟“

”اس کی ایک magnetic field ہے..... اس فیلڈ میں جو بھی داخل ہوتا ہے اس پر کچھ زار داتیں ہوئے لگتیں ہیں۔“
”مثلاً.....“

”مثلاً یہ کہ میں اس جوب کو deserve نہیں کرتا لیکن چونکہ میں شاہب کے مقام طیبی دائرے میں ہوں کوئی مجھ سے یہ نوکری لے نہیں سکتا.....“

”اب تم اس قدر خوش بھی نہ ہو جاؤ عکسی۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، پہنچی نوکری اور وہ بھی نیم سر کاری..... کل بلاست کر دیں تو تمہارا پتہ نہ چلے..... ایویں۔“

”جب تک شاہب نہ چاہے مجھے کوئی بلاست نہیں کر سکتا..... جمیل الدین عالیٰ کو دیکھو..... انشاء جی کو دیکھو..... اپنے خان صاحب کو دیکھو..... ذرا دیکھو..... Watch کرو۔“

Shahab has wished them well, that's all.

جس روز شاہب بھائی کا انتقال ہوا اس روز دوپہر کے وقت مجھے عکسی کی خوبصورت یہوی تمہنہ نے بتایا کہ ”عکسی کے جوب کا براحال ہے اس کی جگہ کوئی اور پوسٹ ہو گیا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب عکسی کو یا تو استغفاری دینا پڑے گا یا چھٹی کرنی ہو گا۔“ - یکدم میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے بابا شاہب اپنی برکتوں کے پاؤں بھی سیست کر ساتھ لے گئے ہیں۔ میں نے عکسی سے پوچھا تو کہنے لگا..... ”ہاں تمہی ٹھیک کرتی ہے حالات مخدوش ہیں۔“

”پھر کوئی سفارش لڑائی؟“

”نہیں۔“

”کوئی سفارش کرو گے؟“

”نہیں.....“

”احق الذی..... انس ناہی کا سچو بھلاوہ کیا کریں گے کوئی مشرشو غیرہ پکڑو تم تو اسلام آباد میں رہتے ہو۔“

”ہرگز نہیں.....“

”ہیں کیا کہہ رہے ہو؟“

عکسی نے اپنی بیکی آنکھیں پوچھیں اور بولا..... ”مجھے یہ نوکری اللہ کی مریانی سے سلوکی ٹرے میں ملی تھی..... میں نے اس کے لئے کوئی کوشش نہیں لڑائی جب تک وہ چاہتے ہیں رکھیں گے جب نہیں چاہیں گے میں چلا جاؤں گا..... لیکن کوشش نہیں کروں گا.....“

”مارے جاؤ گے.....“

”ہاں ہو سکتا ہے“

”تمہارے پنجی چھوٹے اور نازک مزاج ہیں۔“ -

”وہ تو ہے“

”.....“

”زیادہ مت سوچو قدمی ایشناک ہے اب تو شاب صاحب اور آگے چلے گئے ہیں اب کام کیسے خراب ہو سکتے ہیں۔“ -

عکسی چھٹما پنی کے فیصلوں کا عادی ہے۔ سفارش نہ کرنے کا بھگتانا بھی اس نے اسی وقت کھڑے پاؤں کیا تھا۔

اسی طرح سن ۷۲ء میں عکسی مفتی نے اپنی پہلی شادی کا نبیاڑ کرتے ہوئے مجھے انگریزی میں خط لکھا تھا۔

۱۲۔۱۔۷۲

۲۰۲ آدم جی روڑ

راولپنڈی

ڈیریانو!

کل میں نے وزن برٹن کی بنای ہوئی میں چھپیں منٹ کے دورانیے کی قلم ”قال آف ڈھاکر“ دیکھی۔ یہ لوگونگ مجدد کرنے کا ایک تجربہ ہے۔ ریزہ ریزہ کرنے والا جو اور پھر بھی کہتے ہیں کہ ہم اس سچ کی تاب لا میں!

میری روح پر ایک خوفناک اندر ہرا چھا گیا ہے جو چھٹنے کا نام نہیں لیتا۔ میں اپنادل بسلا نے کے چتن کرتا ہوں لیکن یہ سکون بے حد و قی ہوتا ہے۔ ایسے لمحوں میں نہ جانے کتنی بار مجھے تمہارا وہ خط یاد آتا ہے جو نہ جانے تم نے کس دیواں گی میں لکھا تھا۔

”یہ مکمل تہائی ہے جانے سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ شادی اس تہائی کا حل نہیں ہے۔“ -

میں نے اس خط کو احتیاط سے رکھ چھوڑا ہے اور کئی بار اسے یاد کرتا ہوں لیکن اس نصیحت کے باوجود میں نے گھر بانے کا فیصلہ کر لیا ہے میں جانتا ہوں کہ شادی بھی میری مدد نہ کر سکے گی۔ چلو کچھ توبید میں آئے گی اور اس تصنی سے کچھ تو چھن کارا ہو گا۔

انسان ہمیشہ تبدیلی کی خواہش رکھتا ہے۔ اس دنیا میں کچھ بھی ایسا اچھا نہیں جو ہمیشہ رہ سکے۔ تعلیم، ملازمت، یوہی، بچہ، گھر..... ہم ان منزلوں کے سارے زندہ رہتے ہوئے بھی تبدیلی کے خواہاں رہتے ہیں اور بڑھاپے کو جا پکڑتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر آخری ایک ہی منزل رہ جاتی ہے..... موت! ساری منزلوں کی واحد منزل..... بلاشبہ یونگ جیسے بڑے نفیات داں نے اسی لئے کہا تھا..... ”جس طرح ایک سکھ خرچ ہو کر ہی اپنے پورے مول پاتا ہے اسی طرح موت انسانی روح کی صحیح قیمت آئتی ہے“۔ اس طرح یونگ نے ساری انسانی زندگی کی ایک ہی منزل طے کر دی تھی..... موت! میں نے تمہیہ سے درخواست کر دی ہے..... وغیرہ وغیرہ

اس خط کو پڑھ کر میرالو خٹک ہو گیا۔ میں ٹھگوں پر اعتقاد رکھتی ہوں۔ گھر سے نکلتے وقت کالی ملی راستے کا ٹوپ تباہر جانے کے لئے میرے پاؤں نہیں اٹھتے۔ شادی اور موت کا ذکر ایک ہی صفحے پر دیکھ کر میرے طوطے از گئے اور بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔

اس خط کے بعد پورے صترہ سال بعد جون میں ہمیں عکسی نے اپنی دوسری شادی کے بعد خط لکھا

۱۱۔۶۔۸۸

عزیز ترین پانو اور اشراق

اس ماہ رمضان میں میری دوسری شادی ہو گئی۔ میں نے اب کو نہیں بتایا لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ انہیں معلوم ہو گیا ان کے لئے یہ بات بہت تکلیف دہ ہو گی۔ وہ دوسری شادی کو شدید نفرت سے و پچھتے ہیں کیونکہ وہ خود اس کاشکار ہے ہیں..... ساری زندگی!

بہت بہت سال گذرے جب میں بیمار اور تناہ تھا مجھے تمہارا ایک خط ملا تھا، بھی بھی میرے پاس یہ خط ہے..... میں اس کی کالی پیچ رہا ہوں۔ پڑھ لو۔ مجھے یقین ہے تمہیں یہ خط یاد نہ ہو گا، تمہیں یہ بھی یاد نہ ہو گا تم نے یہ خط کیوں لکھا۔ جس طرح تمہیں یاد نہیں کہ یہ خط کیوں لکھا گیا۔ ایسے ہی میں نہیں جانتا کہ میں نے دوسری شادی کیوں کی۔..... مقدر کی عجیب طاقت نے مجھے مجبور کر دیا..... اس طاقت کو نہ میں سمجھتا ہوں نہ ہی اسے کنٹرول کر سکتا ہوں..... وغیرہ وغیرہ

اگر آپ کو میاں یوہی دونوں سے محبت ہو جیسی مجھے اور خان صاحب کو تمہیہ اور عکسی

سے ہے تو بڑی مصیبت پڑ جاتی ہے جو دنوں کی طرفداری کرتے کرتے دنوں کا پواخت آف و یو سمجھنے کی کوشش میں دنوں کو سینے سے لگانے کا عزم کرتے کرتے آپ کسی کو بھی قریب نہیں لا سکتے اور عجیب الہ کا پٹھا محسوس کرتے ہیں۔

دوسری شادی تو عکسی نے بہت بعد میں کی اور مجھے یقین ہے کسی مادر اُمی طاقت تسلیکی۔ لیکن جب سے شاب بھائی کا وصال ہوا ہے تب ہی سے دل میں میرے عکسی کے لئے برا خوف پیدا ہو گیا تھا۔ اس پار جو خلاع اس کے دل میں پیدا ہوا وہ فال آف ڈھاکہ سے کہیں برا تھا۔ شاب بھائی کی موت نے ایک ہی بوکے کے ساتھ عکسی کے کنوئیں کا سارا بیٹھاپانی نکال لیا۔ اب اس کے اندر جھاٹکنے پر کنوئیں کے خالی پن سے خوف آتا تھا۔ اس بار بھی عکسی نے تھائیوں کا وہی علاج سوچا جو مرد عالم طور پر سوچا کرتا ہے۔ مگر ہست کی اوکھلی میں سرفہ کراتنے والے دھوکے کھانا کا پھرنا اپنی ہوش رہے نہ کسی اور کی۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ اس یوہ پتیم پر ترس کھانے والا کوئی نہیں۔ اسے پیار سے باتوں میں لگا کر، کندھے پر باتھ رکھ کر تارچ دکھانے والا بھائی اپنی منزل سیدھی کر گیا۔ اب عکسی سے نہ کسی کی آس گلی ہے نہ ہی عکسی اپنے گھور انہیں میں کسی روشنی کی امید رکھتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے جاتے جاتے شباب بھائی اسے سلوک کی تھاپی پر فقیری کی جنم گھٹنی پیش کر گئے ہیں اب وہ بڑا افسر تھے..... لیکن فوک ہیرنج کے کنوئیں کی خالی تھائی میں شیشے والی لمبی میز پر سر رکھ کر وہ بھی اشفاقِ احمد کی طرح سوچتا ہو گا۔

اوکھا گھاث فقیری دا بھئی اوکھا گھاث فقیری دا

میلان دے وچ ویلا کڈھنا، مینگ دے وچ بہنا
اوکھیاں دے نال متحلا بکے لیں سریں سر کھنا

ہمسدے ہمسدے رہنا

اپنی سیٹ تے عاجز بن کے اٹگے ہو کے بہنا
مرشد موہرے گل نہ کرنی خواہ کھے سو ستنا
دنیاداری کم نہیں ایہہ کم اے پتہ چیری دا
اوکھا گھاث فقیری دا

عکسی جیسا اعتقاد اور مفتی جی جیسا جذبہ آج تک ہمیں نصیب نہ ہو سکا۔ لیکن اس میں ہمارا بھی کیا دوش؟

نہ ہے جیسا اعتقاد ہوتا ہے وہی واردات ہونے لگتی ہے۔ کئی برس ہم شباب بھائی کے ساتھ ساتھ رہے لیکن موی بگلا پانی میں تیرتا رہا اور بھیگا نہیں۔ ہم ان پر وہ بھروسہ نہ کر سکے جو مفتی جی کے گھرانے کی اساس ہے۔ میں مفتی جی کی باتوں کو سنتی، پل بھر کو مانتی پھر بھول جاتی لیکن عکسی کی باتیں جو نکہ

ساری کی ساری انگریزی میں ہوتی تھیں ان کا اثر بھی مجھے جیسی تھڑو رلڈ کی عورت پر دوتا ہوتا لیکن یہ اثر بھی..... وہ کے ساتھ زائل ہو جاتا۔ شاب صاحب کو یہ بابا، اللہ لوک، سائیں یاد شاہ بھانسیرے بس کاروگ نہ تھا۔ ہم تعلیم یافہ، نئی روشنی اور مغربی سوچ کے لوگ تھے۔ ہمارے لئے سن ۷۰ء تک شاب بھائی کی ایسی کوئی جستہ کھلی کیونکہ خود ہمارے وجود کو اس سوچ کی ضرورت نہ تھی۔ ہم اپنے کس بل میں اتنے مشغول تھے کہ کسی اور کی وقتیں ہمیں اگر متاثر بھی کرتیں تو یہ بالکل کتابی بات ہوتی۔ مفتی جی ہمیں دیکھ دیکھ کر جلتے، بے حال ہوتے۔ وہ ہمیں باقتوں کے دینے جلا کر روشنور وشنی کرنا چاہتے تھے۔ نہ خدا ہماری ضرورت تھا، نہ اس کے بندے ہماری لائن تھے ان دونوں مفتی جی کی خط و کتابت کا یہ رنگ تھا۔

بانو!

تم دونوں پر اب کوئی امید نہیں رہی۔ تمہارے ذہن بلندیوں پر پرواز کرتے ہیں۔ تمہارے دل گلے ہوئے ہیں۔ تمہارے اندر دیمک گئی ہوئی ہے۔ تمہارے ایمان اس لئے مضبوط نہیں کہ تمہاری ”انا“ بہت خود سر ہے۔ تم بل نہیں بن سکتے جو دوسرا کا سارا لے۔ تم میں امید کا دیبا نہیں جلتا۔ اس لئے کہ تم اپنی انا کے اندر ہمیرے میں رہتا پسند کرتے ہو۔ تم کسی دوسرے کو دیپ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ میں ایک چھوٹا آدمی ہوں۔ بہت چھوٹی انا، بیل ہوں، سارے لیتا ہوں۔ اتنا غالیظ ہوں کہ پاک صاف کی پاکیزگی مجھے دکھتی ہے، بری لگتی ہے تم دونوں اور میرا کوئی میل نہیں پھر بھی مجھے اس پر فخر ہے کہ میں تم دونوں کے قریب سمجھا جاتا ہوں تھیں جانتا ہوں..... تمہارا دوست سمجھا جاتا ہوں۔

متاز

مفتی جی کا یہ سچا خط ملا۔ ہم پر اثر نہ ہوا کیونکہ ہمارے غبارے میں انا کی گیس ہمیں اوپر ہی اوپر اڑائے لئے جاتی تھی؛ اتنا اوپر کہ کبھی کبھی خوشی سے دل و ہرگز کابند ہو جاتا۔ مفتی جی نے شاب بھائی کے سلسلے میں ہو آخری خط لکھا وہ یہ تھا۔

بانو!

کتے کا کام ہے بھوکنا۔ کوئی سنتے نہ سنتے۔ پرواکرے نہ کرے۔ لاہور میں میری دو چیزیں ہیں۔ جو بے حد مفتی ہیں ایک تم..... دوسرے اشراق، تمہارے بچے اور وہ سب جو تم دونوں کو عزیز ہے۔

میں دیر سے بھونک رہا ہوں۔ تم عقل کی ترازو میں تولتے ہو تو میری بھونک کو تولتے
رہو..... میں بھونکنا بندہ کروں گا۔
اللہ تم سب کو اپنی حفاظت میں رکھے۔

متاز

نہ تو میں مارے نہ امت کے اس خط کا حواب دے سکی نہ ہی مفتی جی سے جھوٹ بولنے کی بہت
پڑی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی طرح اعتماد کرنے کے لئے ان جیسا غیر بھی ضروری تھا۔ اللہ تو
گھڑی گھڑائی صورتیں بھیجا ہے۔ محفل از نے کے خواب تو یکھ سکتی ہے پر اڑے کیسے؟
بہت سال پیچھے کی بات ہے مفتی جی ابھی میڈیا سٹ ماؤن میں رہتے تھے اور انہیں ہومیو پیتھی کا
چکانہ لگاتھا۔ ہم ان کے پاس ٹھمرے ہوئے تھے۔ میرے تینوں بچوں کو موڑ سائکل پر اسلام آباد کی
سیر کرانے کے بعد وہ ان گنت بسکٹوں کے ذبے اٹھائے آنکن میں آئے۔ وہ ہماری محبت سے دک
رہے تھے۔

خان صاحب نے ایک بسکٹ لفافے سے نکال کر کہا ”یار مفتی میں بھول نہ جاؤں..... شاب کو
ضرور ملنائے، بڑا چھادو دست ہے“۔

مفتی جی سدھائے ہوئے بھالو سے خونوار بھیڑیے بن گئے۔

”اوے تو شاب کو پانادوست سمجھتا ہے؟ شاب کسی کا دوست نہیں۔ خان صاحب اس بھرے
میں نہ رہتا ہاں جی۔ جہاں شاب ہے وہاں دوستیاں نہیں ہوتیں۔ یہ صوفی لوگ کب دوستیوں کی
پروا کرتے ہیں۔ یہ ایک اور مخلوق ہے یہ خود غرض لوگ تو مسلک پر بیٹا قربان کر دیتے ہیں“۔ میری
نگاہوں میں ٹاپ گھوم گیا۔

”کون سایہ مفتی جی“ خوفزدہ ہو کر میں نے سوال کیا۔

”حضرت ابراہیم نے بیٹا قربان نہیں کیا تھا؟..... یہ شاب اسی قبل کا ہے..... یہ کب پروا کرتا
ہے بیٹے بیٹیوں کی..... دوست کون ہوتا ہے اس کی ڈکشنری میں یہ لفظ نہیں ہے ہاں“۔ میرے لئے
قدرت اللہ شاب کا یہ بالکل نیا اور انوکھا تعارف تھا۔ میں شاب بھائی کو ایک ایسا درج دل انسان سمجھتی تھی
جو بیٹے قربان کرنے کے قبل نہ تھا لیکن مفتی جی کی بات چوڑکانے والی تھی میرے اعتقادات کو خیس
پچھی۔ کچھ دیر سب خاموشی سے بسکٹ کھاتے رہے پھر خان صاحب نے بڑے جھینپوانداز میں خوش
کرنے والی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے اور شاب کے دریہ نہ تعلقات کا ذکر کیا۔ بُل تو مفتی جی کے حساب
پانی سر سے گزر گیا دہ بولے..... ”اوے تم دونوں اندر ہے ہو..... پیدائشی اندر ہے..... قدیسہ کو اشراق

کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا اور اشفاق کو اپنے سوائے کچھ دکھائی نہیں پڑتا۔ اوگے اندھو! پانی میں رہتے ہو پر تمہارے لیٹھے میسے موی پر کبھی نہیں بھیگتے۔ تم دونوں اشفاق..... یا رہاب میں رہتے ہو اور بالکل خلک جیسے برتی..... "اشفاق خان کادا و خانی گیوں میسار نگ گلابی ہو گیا۔

مفتی جی شدید ہیں اور اظہار کو لازمی سمجھتے ہیں۔ وہ صرف وہاں دوستی پال سکتے ہیں جہاں ہم نظری قائم رہے..... خان صاحب مصر تھے کہ شہاب بھائی ان کے دوست ہیں۔ مفتی جی کے لئے یہ بات بھجنی، ماننی، قبول کرنی ناممکن تھی اس لئے براوڈ نگاہ ہوا۔ جب بھڑاس نکل گئی تو مفتی جی اور خان صاحب مل کر شہاب بھائی کو ملنے چلے گئے اور میراپتہ کاٹ دیا۔

مفتی جی نے اسلام آباد منتقل ہونے کے بعد شہاب صاحب کے متعلق ڈائریکٹر رکھیں، ان کے خط محفوظ کے، اخباروں میں سے تراشے کاٹے۔ وہ شہاب بھائی کے متعلق اتنا ڈیباچ مچ کر چکے تھے کہ کبھی کلگاؤہ دن دور نہیں جب وہ شکر پر زیوں کے درختوں پر شہاب شہاب لکھا کریں گے اور اگر کسی نے انہیں رد کا تودہ روکنے والے کا سر قلم کر دیں گے..... لیکن اتنا سارا اظہار بھی حجاب بن گیا اور مجھے اصلی شہاب بھائی نظر نہ آسکے۔

اظہار کا طریقہ جب فیل ہو گیا اور میں ان سے بادلہ خیال کے باوجود کچھ بھی نہ سمجھ سکی تو میری کھوچ نے ایک اور راستہ محسوس کیا۔ یہ طریقہ خان صاحب کا ہے۔ خان صاحب دیبات سے آئے ہیں۔ گاؤں میں لوگ آسمان کو دیکھ کر بارش کا ندازہ لگاتے ہیں۔ ہواں کا رغبہ نہیں موسوں کا پتہ دیتا ہے۔ میری بولے تو بارش مانگتی ہے۔ کو کائیں کائیں کرے تو پرہوتا آتا ہے۔ کسان کے طرح نظرت کے راز کھیتوں، درختوں، کھلیاں میں بکھرے چڑے ہیں۔ خان صاحب کو ہر کسان کی طرح بیشہ سے بزرگوں کی بُھی پربدا اعتماد ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قرن ہا قرن سے جو عقائدی اور سوچھ فضائل اکٹھی ہوتی رہی ہے اگر آج کا انسان اسی سوچ کا فائدہ اٹھائے تو کئی رائیگاں سفر ختم ہو جائیں۔ خان صاحب کا خیال ہے کہ سائنسیں چونکہ اپنے پرکھوں کی عقل، نصیحت، انکے خوابوں، تجربوں پر جل کر آگے بڑھتی ہے اسی لئے سائنسیں کا سفر سیدھی لائیں میں ہے اور انسان چونکہ پچھلی عقل سلیم کے سور سے فائدہ نہیں اٹھاتا اس لئے بھی نوع انسان کے رویوں کی گرو تھے دائرے میں ہوتی ہے۔ ہر پوچھے اپنے تجربے خود کرتی ہے۔ پچھلے بابوں کے نچوڑ سے فائدہ نہیں اٹھاتی اس لئے اسکا سفر بیشہ دائرے میں رہتا ہے کبھی یہ دائزہ آتش بازی کے دائرے کی طرح اوپر چڑھتا ہے کبھی میرے ہیوں کے سپاڑل کی طرح اٹھتا ہے لیکن بنی نوع انسان کی ذات کا ارتقا سیدھی لائیں میں نہیں ہو پاتا اسی لئے ہر پوچھی عموماً ریس کے شارٹنگ پاؤئٹ سے ہی سفر شروع کرتی ہے۔ سانچھ ستر سال کا سفر ختم کر کے جب منزل پر پہنچتی ہے تو دوسری پوچھ منزل سے شارت نہیں لتی بلکہ پھر شارٹنگ پاؤئٹ پر پہنچ جاتی ہے اسی طرح انسان کبھی ارتقا کی



اشفاق احمد

طرف نہیں چل سکتا اسروں میں گھومتا رہتا ہے۔

خال صاحب سوگھ کر، محسوس کر کے، دیکھے بغیر جوانہ زانہ لگاتے ہیں۔ اسکا اظہار کبھی نہیں کرتے۔ انہوں نے شاب بھائی کو کبھی ابوالفضل، ابوالکلام، ابوالحسن نہ پکارا، وہ انہیں قطب، ولی، ابدال ثابت نہیں کرنا چاہتے۔ وہ تو یہ شے تکلفی سے شاب بھائی کو پاسب سے پیارا دوست ہی سمجھتے رہے۔ لیکن ایک چھوٹی سی بزرگتری ایسی بھی ہمارے گھر میں موجود ہے جس پر شاب بھائی کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی آیتیں، وظیفے، وردر قم ہیں۔ کیا خال صاحب ان طفیلوں پر عمل کرتے ہیں؟ کیا شاب بھائی ان کی تعلیم فرماتے رہے ہیں؟ کیا خال صاحب جو بڑے گھر ہستی، منظم اور کثیر المقاصد شخص ہیں، ایسی اندر وہی زندگی کو باقاعدگی سے اپنا سکتے ہیں؟ اس چھیستان کی طرف کوئی اشارہ مکمل طور پر نہیں ملتا کیونکہ کسان فطرت کی باتیں سمجھتا ضرور ہے ان کا بر ملا ذکر کسی سے نہیں کرتا۔

ابھی ہم سمن آباد میں تھے جب مجھے خال صاحب کے طریق پر عمل کر کے احساس ہو گیا کہ بظاہر وہ بہت معمولی روشن اختیار کر کے، معمول زندگی کو عام سطح پر رکھ کر، ہنسی مذاق کا پردہ ڈال کر چلنے والے ہیں شاب بھائی ہر گز ہر گز عام روشن کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کے عمل کاظمیہ گوئی سمجھ میں نہیں آیا لیکن وہ تھہ در تھہ زندگی پر کرتے ہیں۔ مجھے اس بات کی سمجھ بالکل ویسے ہی آئی جیسے ہواں میں منہ انھا کر کسان کرتا ہے..... ”آج سپر کے وقت بارش آئے گی..... کوئے گدھ اوپنچے اوپنچے اڑ رہے ہیں“۔

سمن آباد میں ہمارا گھر بیوب ویل والی گراونڈ کے سامنے نکل رہا تھا۔ اس گھر کی دو منزلہ عمارت اور کافی بڑی مضبوط تھی۔ چھوٹے سے یہ وہی برآمدے میں ایک پر بنگ میں پڑی رہتی تھی۔ جس پر ہم کبھی چادر، کبھی ترپال اور کبھی گتے کی شیٹ ڈال کر اس کی حفاظت کا انتظام کیا کرتے تھے۔ پھاٹک کے ساتھ ساتھ وہ تین فٹ اونچی دیوار تھی جس پر میرے بیٹے اینیں خان اور انہیں خان دونوں بازو پھیلایا کر چلنے کی پیش کیا کرتے تھے جیسے سرکس میں لیڈی تار پر چھتری لے کر چلتی ہے اور اشیر خان سیرھی پر بیٹھ کر ان کا واحد تماثلی ہوا کرتا تھا۔ اگر اشراق خان گھر پر نہ ہوتے تو شاب بھائی اس برآمدے سے آگئے نہ بڑھتے۔ یہیں پر بنگ میں کے پاس کھڑے ہو کر کچھ نہ امت، کچھ لاجبت اور کچھ اوپرے پن سے میری خیریت پوچھتے..... پھوں کا سرکس دیکھتے۔ اشیر خان کی گال چھو کر، شرماۓ سے، اس کا حال پوچھتے اور چلے جاتے..... خال صاحب کے سوائے اس گھر میں ان کا کوئی واقف نہ تھا۔

اسی واقفیت کو بڑھانے کے لئے ایک روز مجھے خال صاحب نے کہا ”بھی کل شام شاب اور غفت کھانے پر آرہے ہیں تم کوئی انتظام وغیرہ کر لینا۔“

مجھے مہمانوں کی خوشی بہت چڑھ جاتی ہے۔ میں اس معاملے میں ریگستان میں رہنے والے بد